ٹامس کارلائل

# سیّدالانبیاءؐ

ٹامس کارلائل انیسویں صدی کا ایک نامور انگریز مصنف، مورخ اور مفکر تھا۔ اس کے لکچروں کا مجموعہ "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" بہت مشہور ہے جس میں ایک لکچر حضور رسالت مآبؐ کے متعلق بھی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ عیسائی اہل قلم اور اہل کلیسا اسلام اور بانیِ اسلام پر طرح طرح کے الزامات عائد کر کے اپنے مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا ثبوت دیتے تھے کارلائل نے پیغمبر اسلام کی عظمت کا اعتراف جس خلوص و دیانت کے ساتھ کیا ہے وہ خود اس کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی دلیل ہے۔ پیش نظر مضمون کارلائل کے اسی لکچر سے ماخوذ ہے۔

ہمارے پیش نظر ہیرو (محمدؐ) کو اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں مانا گیا بلکہ ایسا انسان سمجھا گیا جسے خدا کی طرف سے وحی ہوئی یعنی پیغمبر ——— کسی بڑے انسان کو خدا سمجھ لینا لوگوں کی نہایت فاش اور ابلہانہ غلطی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ یہ مشکل سوال پیش رہا ہے کہ دراصل اسے کیا سمجھنا چاہیئے اور کس طرح اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ کسی عہد کی تاریخ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں نے کسی جلیل القدر انسان کا استقبال کس طرح کیا۔ لوگوں کو ہمیشہ ایسے انسان میں صفاتِ ایزدی کا کچھ نہ کچھ پرتو نظر آیا ہے اور یہ نہایت اہم سوال رہا ہے کہ لوگ ایسے شخص کو خدا سمجھیں یا پیغمبر یا کچھ اور ——— حضرت محمدؐ میرے خیال میں یقیناً پیغمبر صادق ہیں اور میں آپ کے وہ اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں جو انصاف کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہیں۔ حضرت محمدؐ کے متعلق ہم عیسائیوں کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ "آپ دغاباز اور کذاب مجسم تھے اور آپ کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے"۔ کذب و افترا کا وہ انبارِ عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا ہے خود ہمارے لیے شرمناک ہے۔ اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہے ہیں یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی ہماری طرح خدائے تعالیٰ کے دستِ قدرت کا نمونہ ہیں۔ بندگانِ خدا کی بیشتر تعداد آج بھی کسی اور شخص کی بہ نسبت محمدؐ کے اقوال پر ایمان رکھتی ہے۔ کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازی گری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے؟ کیا ایک جھوٹا آدمی کسی مذہب کا بانی ہو سکتا ہے؟ جھوٹا آدمی تو اینٹ اور چونے کا ایک مکان تک نہیں بنا سکتا۔ اگر کسی شخص کو مٹی، چونے اور اُن اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہ ہو اور وہ ان کا پورا لحاظ نہ رکھے جو مکان کی تعمیر

میں استعمال ہوتے ہیں تو اس کا بنایا ہوا مکان مکان نہ کہلا سکے گا۔ بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ ایسا مکان بارہ صدی تک نہیں قائم رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خلوص، بڑا گہرا خلوص اور سچا خلوص ہر بڑے انسان کی پہلی خصوصیت ہے۔ اور ایسے شخص کو ہم "اوریجنل انسان" کہتے ہیں اس کی فکر کسی پہلے مرقع کی نقل نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسا قاصد ہے جو پردۂ غیب سے پیغام لے کر ہمارے پاس بھیجا گیا۔ خواہ ہم اسے شاعر کہیں یا پیغمبر یا دیوتا۔ بہرصورت ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ساری نوع انسان کے الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت اشیا کی روح رواں سے نکلتا ہے اور رات دن اسی میں بسر کرتا ہے۔ اوہام اس سے اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ وہ اندھا ہو۔ بے خانماں ہو۔ مصیبت زدہ ہو۔ روزمرہ کی گفتگو میں منہمک ہو لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح ہر وقت اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ کیا اس کے الفاظ فی الحقیقت ایک طرح کی وحی نہیں ہیں؟ جب اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی اور لفظ ہی نہ ہو تو پھر ہم وحی کے سوا اُسے کس نام سے تعبیر کریں؟ ایسے انسان کی ہستی قلب کائنات سے ابھرتی ہے اور وہ اشیا کی بنیادی حقیقت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس دنیا میں بہت سے الہام بھیجے ہیں۔ لیکن کیا یہ شخص اس کا آخری اور تازہ ترین مظہر نہیں ہے؟ "اس کی عقل وحی کی پروردہ ہوتی ہے"۔۔۔۔ ہم کسی طرح حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ باز اور ان کی تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پیغام جو آپ لے کر آئے تھے بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز تھی جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جادۂ تاباں تھا جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا۔ اور جسے خالق عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

آں حضرت نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے چچا کے ساتھ تجارت اور دوسرے اغراض کے لیے مختلف سفر کیے۔ لیکن آپ کا اہم ترین سفر وہ ہے جو سن شعور سے چند سال قبل شام کے میلوں میں شرکت کی غرض سے آپ نے اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اس موقع پر پہلی دفعہ آپ کو بیرونی دنیا کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور آپ اس عنصر جدید (یعنی مذہب عیسوی) سے واقف ہوئے جو آپ کے لیے بے انتہا اہم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سفر کے اثنا میں حضرت ابوطالب اور آپ سرجیس نام ایک نسطوری راہب کے ہاں ٹھیرے تھے جس نے آپ کو مذہب عیسوی کی تعلیم دی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم عمر بچہ کو کوئی راہب کیا تعلیم دے سکتا ہے۔ غالباً نسطوری راہب کے اس واقعہ میں بہت مبالغہ کیا جاتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ کی عمر اس وقت چودہ سال کی تھی اور آپ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔

یہ امر کہ آپ نے جوشِ شباب کے ختم ہونے تک بالکل معمولی طریقہ پر اور نہایت سادگی و خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارے بجائے خود اس خیال کی تکذیب کرتا ہے کہ آپ کی نیت میں کسی طرح کا مکر و فریب تھا۔ چالیس سال کی عمر میں آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اُس وقت تک بھی آپ کی ساری کوشش پاک زندگی بسر کرنے کے لیے تھی اور آپ کی شہرت بہت اچھی تھی اور ہمسائے آپ کے متعلق بہت نیک خیالات رکھتے تھے۔ مخالفوں کا یہ کہنا کہ جب بڑھاپا آپہنچا ساری گرمیٔ شباب ختم ہو گئی اور آپ کے لیے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز باقی رہی تو اس وقت آپ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے سارے گزشتہ خصائل و فضائل پر پانی پھیر کر ایک ایسی شے کے لیے مکر و فریب اختیار کیا جس سے آپ کسی طرح متمتع نہ ہو سکتے تھے، ایک ایسی بات ہے جس کو میں کبھی تسلیم نہیں کر سکتا ـــ نہیں! نہیں! اس سیہ چشم، پاک طینت اور صاف باطن انسان میں، جسے مادرِ صحرا نے اپنے آغوشِ شفقت میں پالا تھا، جذبۂ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہ تھی بلکہ کچھ اور ہی خیالات موجزن تھے۔ یہ اُس قسم کی بزرگ و برتر جان پاک تھی جسے خلوص و صداقت کے بغیر گذر ہی نہیں۔ جس کے خمیر میں خود فطرت اخلاص کو جگہ دیتی ہے جس وقت اور لوگ اوہام میں مبتلا تھے اور اسی پر اڑے رہنے کے لیے جنگ و جدل کر رہے تھے۔ اس شخص کی عقل پر وہم و گمان کا پردہ نہ پڑ سکا۔ وہ اپنی روح اور حقائق اشیاء کے ساتھ سب سے الگ تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رازِ ہستی اپنے بیم و رجا کے ساتھ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا جس کے وجود کو کسی طرح کا وہم و گمان پوشیدہ نہ کر سکا۔ یہ صفت جسے ہم نے "خلوص" کے لفظ سے تعبیر کیا درحقیقت صفاتِ ایزدی کا ایک پرتو ہے اور ایسے انسان کی آواز دراصل ہاتفِ غیب کی آواز ہے جسے لوگ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں اور انہیں سننا چاہیئے کیونکہ اُس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

آنحضرتؐ کی عمر کا چالیسواں سال تھا۔ آپ ماہ رمضان میں تسبیح و تحلیل اور ان مسائل پر غور و فکر میں بسر کرنے کی غرض سے مکہ کے قریب کوہ حرا کے ایک غار میں تشریف لے گئے تھے کہ ایک دن آپ نے اپنی بیوی خدیجہؓ سے فرمایا کہ فضلِ باری تعالےٰ سے تمام عقدے حل ہو گئے۔ میرے سارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے اور میں حقائق و معارف کو بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ یہ تمام اصنام و عقائد مہمل ہیں۔ مٹی کے کھلونے ہیں۔ سارے عالم کا مالک خدائے واحد ہے۔ ہمیں ان تمام بُتوں سے منہ موڑ کر اُسی ذاتِ واحد کے آگے سر جھکانا چاہیئے۔ صرف وہی ایک ذات بزرگ و برتر ہے۔ اس کے سوائے عظمت و رفعت کا کوئی شایاں نہیں۔ وہ حقیقت ہے یہ بت مجاز۔ اُسی نے ہمیں پیدا کیا۔ وہی ہمیں پال رہا ہے اور ہم سب اسی کا پرتو ہیں۔ اسی حسنِ ازل کی ایک عارضی نقاب ہیں۔ "اللہ اکبر" یعنی خدا ہی بزرگ و برتر ہے۔ اور "اسلام" کا مطلب ہے راضی برضائے الٰہی رہنا۔ یہ سمجھنا کہ ہماری قوت اسی کی کامل اطاعت میں مضمر ہے۔ وہ ہماری دنیا اور آخرت کے لیے جو چاہے کرے۔ جو کچھ ہمارے

لیے بھیجے خواہ وہ موت ہو یا موت سے بدتر کوئی چیز؛ وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم اپنے کو اسی کے حوالے کرتے ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے کہ "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں؟" اسلام عبارت ہے ایثارِ نفس اور نفس کشی سے۔ یہ عقل کا وہ نقطۂ کمال ہے جو قدرت اس دنیا پر اب تک منکشف کر سکی اور یہی وہ نور ہے جو اس امی سید عربیؐ کی روح کو منور کرنے کے لیے ظاہر ہوا تھا۔ حیاتِ سرمدی کے اس مہر منور کو جو ظلمت کدۂ موت میں طلوع ہوا تھا آنحضرتؐ نے "وحی" اور "فرشتہ جبرئیل" کے نام سے موسوم کیا۔ کیا آج بھی کوئی بتا سکتا ہے کہ اُسے اور کس لفظ سے تعبیر کرنا چاہیئے؟ ..... آنحضرت کی تبلیغ قدرتاً قریش کو ناگوار گزری جو کعبہ کے پاسبان اور بتوں کے متولی تھے۔ دو ایک ذی اثر آدمی اسلام لے آئے تھے۔ اسلام گو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا لیکن اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا تھا جس سے ہر شخص ناراض ہو رہا تھا اور کہتا تھا کہ "یہ کون ہیں جو اپنے کو ہم سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ ہمیں احمق اور ہمارے بتوں کو لکڑی کے کھلونے ٹھیراتے ہیں۔" آخر آپ کے خوش صفات چچا ابوطالب نے آپ سے کہا "جان عم! کیا تم اس تبلیغ سے باز نہیں آ سکتے؟ اپنی حد تک اس عقیدہ کے پابند رہو۔ لیکن اس کا چرچا کر کے دوسروں کو پریشان کرنے، سرداران قبائل کو ناراض کرنے اور ہمیں خود اپنے کو خطرہ میں ڈالنے سے کیا حاصل؟" آنحضرتؐ نے یہ سن کر جواب دیا کہ "اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند آ کر اس تبلیغ سے باز رہنے کی خواہش کریں تو بھی میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا۔" اس پیغام صداقت میں جو آپ لے کر آئے تھے ایک ایسا فطری عنصر شامل تھا جو آفتاب و ماہتاب غرض فطرت کی کسی صنعت سے کم نہ تھا۔ یہ عنصر مہ و خورشید اور تمام انسانوں اور اشیاء کی مخالفت کے باوجود اُس وقت تک اپنا اظہار کرتا رہے گا جب تک اسے خدائے تعالیٰ کا حکم ہوگا۔

ہجری سنہ عیسوی سنہ ۶۲۲ء کے مطابق ہے۔ اُس وقت آنحضرتؐ کی عمر ترپن سال کی تھی۔ آپ بوڑھے ہو چکے تھے اور آپ کے احباب ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ آپ کا راستہ سنسان اور پر خطر تھا اور بجز اس کے کہ خود آپ کا دل نورِ اُمید سے روشن تھا، ظاہری صورت حال نہایت تاریک تھی۔ ایسی صورتوں میں سب آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ اب تک آنحضرتؐ نے صرف ترغیب و تلقین کے ذریعہ اپنے مذہب کی اشاعت فرمائی تھی۔ لیکن جب ستم شعار اعدا نے آپ کو بے رحمی کے ساتھ وطن سے نکال دیا اور نہ صرف اس پیغام ایزدی کی طرف سے بے اعتنائی کی بلکہ آپ کی جان کے بھی درپے ہوئے تو مادرِ صحرا کے اُس پرجوش فرزند نے اس طرح اپنی مدافعت کا تہیہ کیا جو ایک انسان اور ایک عرب کے شایاں تھا۔ اس نے کہا "اگر قریش اسی پر تلے ہوئے ہیں تو یہی سہی۔ یہ لوگ اس پیغام کو نہیں سننے جو اُن کے اور تمام نوعِ انسان کے لیے بے انتہا اہم ہے اور چاہتے ہیں کہ اُسے جبر و تشدد اور قتل و غارت کے ذریعہ دبا دیں۔ اچھا! تو انہیں شمشیر آزمائی بھی کر لینے دو۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کو دس سال اور ملے جو سخت جنگ و جدل اور جد و جہد میں صرف ہوئے ۔ اس شدید کش مکش کا جو نتیجہ نکلا وہ آج ہمارے پیش نظر ہے ۔ اسلام کے بزور شمشیر پھیلنے کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار اسی کو قرار دے لیں تو یہ ایک بنیادی غلطی ہو گی ۔ تلوار استعمال بیشک ہوئی مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے؟ ہر نیا خیال ابتداً ایک ہی شخص کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اسی میں جاگزیں رہتا ہے ۔ ساری دنیا میں صرف ایک انسان اپنے تمام ابنائے جنس کے خلاف اس کا پابند ہوتا ہے ۔ اگر وہ اکیلا تلوار لے کر اس خیال کی اشاعت کرنا چاہے تو شاید ہی کچھ حاصل ہو ۔ اس لیے پہلے تو اسے تلواریں بہم پہنچانی پڑیں گی ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خیال خود بخود وسعت اختیار کرتا جاتا ہے ۔ مذہب عیسوی کا دامن بھی ہمیں انسانی خون کے دھبوں سے پاک نہیں نظر آتا ۔ جب اس کے ہاتھ میں تلوار آئی تو اس نے بھی اس کا استعمال کیا ہے ۔ کیا شارلیمین کے عہد میں سکسینیوں کا تبدیل مذہب تبلیغ کا نتیجہ تھا؟ اس لیے زور شمشیر کا اعتراض میری رائے میں کوئی وقعت نہیں رکھتا ۔ میرے نزدیک اس دنیا میں ہر شے کو جد و جہد کا حق حاصل ہے خواہ وہ زبان سے ہو یا تلوار سے یا کسی اور ایسے ذریعہ سے جو اسے میسر آجائے ۔ وہ ہر چند تبلیغ و تلقین کرے ۔ لڑے جھگڑے اور ایڑی چوٹی کا زور لگائے ۔ لیکن انجام کار یہ جد و جہد کسی ایسی چیز پر غالب نہ آسکے گی جو مغلوب ہونے کی مستحق نہ ہو ۔ جو چیز اس سے بہتر ہے ۔ وہ اس کو ہرگز زیر نہیں کر سکتی البتہ جو چیز اس سے بدتر ہے اس پر وہ ضرور قابو پالے گی ۔ اس مبارزت عظمیٰ میں خود قدرت ثالث ہے جو کبھی غلطی نہیں کر سکتی اور آخر کار وہی شے فروغ پائے گی جو سب سے زیادہ مطابق فطرت ہے ۔ اور جسے ہم عام طور پر "صادق ترین" کہتے ہیں ۔

مادر صحرا کے اس اُمی فرزند (آنحضرتؐ) نے اپنے پُرخلوص اور روشن ضمیر کے ذریعہ سے جو موت و حیات کی طرح صداقت سے معمور تھا ، اور اپنی نگاہِ حقیقت آشنا کی بدولت جو بالکل خداداد تھی ، عربوں کی لایعنی بُت پرستی ، یونانیوں اور یہودیوں کے مذہبی مناظرات ، قدیم روایات ، رسم و رواج اور فضول کج بحثیوں میں سے اصل حقیقت کو پا لیا اور فرمایا کہ " بت پرستی فعل عبث ہے ۔ ان لکڑی کے بُتوں کو تم لوگ تیل اور موم لگاتے ہو اور انہیں مکھیاں چمٹتی ہیں ۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہیں جو تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے ۔ یہ پوچ اور مہمل شرک اور کفر ہے ۔ اگر تم ان کی حقیقت سمجھو تو ان کا وجود دہشت خیز اور نفرت انگیز ہو جائے ۔ بقا صرف خدا کی ذات کو ہے ۔ قوت و اقتدار اسی کو حاصل ہے ۔ اسی نے ہم کو پیدا کیا ۔ وہی ہم کو مار اور جلا سکتا ہے ۔ "اللہ اکبر" ۔ اللہ بہت بڑا ہے ۔ یہ سمجھ لو کہ تمہارے حق میں وہی بہتر ہے جو وہ چاہے ۔ خواہ وہ تمہارے نفس کو کتنا ہی گراں گزرے لیکن تم اسی کو بہترین پاؤ گے ۔ تم اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو ۔ دنیا اور عقبیٰ میں تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔" اگر وحشی بت پرستوں نے آپ کے اس پیغام کو قبول کر لیا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے

لیے اسے اپنے حرارت بھرے سینوں میں جگہ دی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میرے نزدیک وہ اسی طرح قبول کیے جانے کے قابل تھا۔ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی یہی ایک ایسا پیغام ہے جسے ہر شخص کو قبول کرنا چاہیئے۔ اس سے انسان اس معبدِ عالم کا سرنشین بن جاتا ہے۔ خالق جہاں کے احکام کا ہم صغیر ہو جاتا ہے اور ان احکام کی احمقانہ مخالفت کے بجائے ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے لگتا ہے۔ آج تک مجھے فرض شناسی کی اس سے بہتر تعریف نہ معلوم ہو سکی۔ مقصد کائنات کا ساتھ دینے میں تمام محاسن شامل ہیں۔ اس سے انسان کو نیکی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے کیونکہ مقصد کائنات کا کامیاب ہونا ضروری ہے اور وہ صراط مستقیم پر رہتا ہے۔

آنحضرتؐ سے معجزات ظہور میں نہیں آئے اور آپ نے اکثر بلا تامل کہہ دیا کہ "میں معجزے نہیں کر سکتا۔ میں ہادی خلق ہوں اور میرا کام ان عقائد کو تمام مخلوق تک پہنچانا ہے۔" اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آپ کے نزدیک یہ کائنات ایک معجزۂ عظیم رہی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "اس دنیا کو دیکھو! کیا وہ دستِ قدرت کی عجیب و غریب صنعت نہیں ہے؟ یہ ایک نشانی ہے تمہارے لیے اگر تم دیدۂ بینا رکھتے ہو۔ یہ زمین خدا نے تمہارے لیے پیدا کی اور اس پر راستے بنا دئے تم اس پر رہ سکتے ہو اور چل پھر سکتے ہو۔" عرب جیسے گرم و خشک ملک میں بادلوں کا وجود آنحضرتؐ کے لیے حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "بادلوں کے یہ پرے جو سینۂ فلک کی گہرائی سے نکلتے ہیں؟ آخر کہاں سے آتے ہیں؟ سیاہ ابر کے یہ دل کے دل آسمان پر جمع ہوتے اور برستے ہیں، جن سے مردہ زمین جی اٹھتی ہے۔ سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور کھجوروں سے لدے ہوئے بلند سایہ دار درخت پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟ تمہارے مویشی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے جو تمہاری خدمت کرتے اور تمہارے لیے غذا اور لباس بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ شام کے وقت قطار در قطار گھروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور تمہارے لیے ایک نعمت ہیں۔" آپ نے اکثر جہازوں کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "وہ بڑے متحرک پہاڑ اپنے کپڑوں کے پر پھیلا کر سرعت کے ساتھ پانی پر چلتے ہیں۔ آسمانی ہوائیں انہیں چلاتی ہیں اور جب کبھی خدائے تعالیٰ ہوا بند کر دیتا ہے وہ رک جاتے ہیں اور حرکت نہیں کر سکتے۔" معجزات! آپ فرماتے ہیں کہ تم لوگ کیا معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تمہارا وجود خود ایک معجزہ نہیں ہے؟ خدا نے تمہیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا۔ اس سے پہلے تمہارا وجود بھی نہ تھا۔ پھر جب تم پیدا ہوئے تو بہت چھوٹے سے تھے۔ اس کے بعد تم میں سن آیا۔ طاقت آئی۔ اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ مگر پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ تم بوڑھے ہو جاتے ہو۔ تمہارے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ تمہاری طاقت جواب دینے لگتی ہے۔ اور آخر کار تم فنا ہو جاتے ہو۔ آپ کا یہ جملہ خصوصاً مجھے پسند ہے کہ "خدائے تعالیٰ نے تم میں ہمدردی کا مادہ پیدا کیا۔ اگر یہ نہ پیدا کرتا تو تم لوگوں کا کیا حال ہوتا؟" یہ ایک نہایت اعلیٰ اور اچھوتا خیال ہے۔ حقیقتِ اشیاء کی ایک نادر جھلک ہے۔

آپ کی طبیعت میں شاعرانہ کمال اور بہترین و صادق ترین خیالات کے آثار پائے جاتے ہیں - آپ ایسی اعلیٰ ذہانت، بصیرت اور دل و دماغ کے مالک تھے کہ شاعر، بادشاہ، مذہبی پیشوا غرض جس قسم کے مشہور انسان بننا چاہتے بن سکتے تھے - آپ پر ہمیشہ یہ بات عیاں رہی کہ یہ کائنات سراپا ایک معجزہ ہے جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے - اسکینڈی نیویا کے باشندوں اور دوسرے مفکرین کی طرح آپ کی بھی یہ رائے ہے کہ یہ عالم جو بظاہر بالکل حقیقی اور مادی دکھائی دیتا ہے، دراصل ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود اور قدرت کا صرف ایک مرئی اور محسوس مظہر ہے - فضا کے سینۂ عریاں پر ذاتِ الٰہی کا ایک پرتو ہے اور بس - اس سے زیادہ کچھ نہیں - چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ " یہ بڑے بڑے پہاڑ ایک دن بادلوں کی طرح پھٹ کر آسمان میں غائب ہو جائیں گے "۔ سیل لکھتا ہے کہ " عربوں کے عقیدہ کے مطابق آپ نے زمین کو چوڑی چکلی ظاہر کیا ہے جس کے مستحکم کرنے کے لیے پہاڑ قائم ہیں - قیامت کے دن یہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ جائیں گے اور زمین اس قدر گھومے گی کہ تباہ ہو کر گرد و غبار کی طرح خلا میں غائب ہو جائے گی - خدائے تعالیٰ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹائے گا اور وہ فنا ہو جائے گی "۔

آنحضرتؐ پر اللہ تعالیٰ کا عالمگیر اقتدار ہر وقت عیاں تھا - یعنی آپ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام اشیاء کی اصلی طاقت، روح اور حقیقت کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ایسی ناقابل بیان قوت عظمت اور جبروت موجود ہے جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا - یہی چیز عہد حاضر میں قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے - اور کوئی آسانی شے نہیں سمجھی جاتی - بلکہ سرے سے ایک شے ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ وہ اشیاء کا ایسا مجموعہ تصور کی جاتی ہے جو صفات ایزدی سے معرا اور ہیچ کارہ ہو - موجودہ علوم و فنون کے انہماک میں اس کا احتمال ہے کہ ہم خدا کو بھلا بیٹھیں حالانکہ اس کو بھولنا نہ چاہیئے - کیونکہ اگر وہی بھلا دیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں پھر کونسی چیز یاد رکھنے کے قابل رہے گی - اس صورت میں تمام علوم بالکل مہمل، مردہ اور بیکار ہو جائیں گے - اعتقاد باری تعالیٰ کے بغیر بہترین علوم بھی چوب خشک ہوں گے نہ کہ درخت سبز جس سے ہر دم نئی لکڑی حاصل ہو سکے - انسان کسی نہ کسی طریقہ پر خدا کی پرستش کئے بغیر کچھ نہیں جان سکتا - اگر یہ نہ ہو تو اس کا سارا علم و فضل ہیچ ہے -

اسلام کوئی آسان مذہب نہیں - اس میں روزہ داری، طہارت، سخت اور پیچیدہ مسائل، دن میں پانچ دفعہ نماز، شراب سے اجتناب، غرض ایسے احکام ہیں جن پر نظر کرتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آسان ہونے کی وجہ سے مقبول ہوا - اور ایک اسلام پر کیا منحصر دنیا میں کوئی مذہب یا مذہبی عقیدہ محض سہل ہونے کی وجہ سے نہیں رائج ہو سکتا - یہ کہنا کہ انسان تن آسانی، عیش پرستی، صلہ کی امید، یا مئے و انگبین کی لالچ سے، خواہ وہ اس عالم میں ہو یا دوسرے عالم میں، اعمال نیک کی طرف مائل ہوتے ہیں دراصل نسل آدم پر بہتان لگانا ہے

ذلیل ترین انسان میں بھی شرافت کا کچھ نہ کچھ جوہر موجود ہوتا ہے۔ ایک غریب سپاہی بھی جو صرف اپنی جان قربان کرنے کے لیے ملازم رکھا جاتا ہے ایک خاص عزت رکھتا ہے جو اس کی حقیر تنخواہ اور فوجی قواعد وضوابط سے مختلف ہوتی ہے۔ نسل آدم کا ادنیٰ ترین فرد بھی اپنے دل میں جس چیز کی موہوم سی تمنا رکھتا ہے وہ مئے وانگبین کی لذت نہیں بلکہ اعمال صالح کا شوق اور خدا کے ایک نیک بندہ کی حیثیت سے جنت میں داخل ہونے کی آرزو ہے۔ آپ اُسے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ ایک سست ترین مزدور بھی آسمان شہرت پر چمک جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو تن آسانی کے ذریعہ نیک کاموں کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے وہ بنی نوع انسان پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ مصیبت، ایثار، شہادت اور موت ہی وہ موجبات ترغیب ہیں جن سے قلب انسانی متاثر ہوتا ہے۔ اگر یہ اندرونی شمع حیات روشن کر دی جائے تو اس سے ایسا شعلہ پیدا ہو گا جو تمام آلائشوں کو جلا دے گا۔ ادنیٰ طبقہ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مسرت وشادمانی ہی کارہائے نمایاں کی ترغیب دلانے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ تر ذرائع کی ضرورت ہے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ انسانوں کی شکم پروری سے نہیں ہوتا بلکہ ان اعلیٰ جذبات کے اکسانے سے جو ہر قلب انسانی میں خوابیدہ ہیں۔

کہنے کو خواہ کچھ ہی کہا جائے لیکن محمدؐ کے دامن پر کبھی ہوس پرستی کا دھبہ نہیں لگ سکتا۔ یہ انتہائی غلطی ہو گی اگر ہم آپ کو نفس پرست سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ آپ کسی طرح کے عیش وعشرت کے عادی تھے۔ آپ کا اثاث البیت بہت ہی ادنیٰ قسم کا تھا۔ آپ کی معمولی غذا جو کی روٹی اور پانی تھی۔ بعض دفعہ مہینوں آپ کے گھر میں چولھا تک نہ سلگتا۔ عرب مورخین بجا فخر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "آپ اپنی نعلیں خود درست کرتے اور اپنی عبا پر خود پیوند لگاتے۔" آپ ایک غریب، جفاکش اور تنگ دست انسان تھے جنہیں کسی طرح کی محنت ومشقت سے عار نہ تھا۔ غرض آپ کسی حیثیت سے بُرے نہیں کہے جا سکتے تھے۔ آپ میں تمام خواہشات جسمانی سے اعلیٰ تر ایک جذبہ کارفرما تھا، ورنہ وہ تند خو عرب جو تیئس سال آپ کے زیر علم لڑتے رہے اور جنہیں ہر وقت آپ کے ساتھ نشست وبرخاست کا موقع ملا، آپ کی اس قدر تعظیم نہ کرتے۔ وہ آتش مزاج لوگ تھے جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھتے اور ہر طرح کا فتنہ وفساد برپا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ ان پر سچی قابلیت اور جرأت کے بغیر کوئی شخص حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ آپ کو پیغمبر کہتے تھے۔ حالانکہ آپ ان کے روبرو بالکل صاف وسادہ حالت میں بغیر کسی نقاب وحجاب کے کھڑے تھے۔ انہوں نے آپ کو عبا سیتے، نعلیں درست کرتے۔ لڑتے۔ مشورہ کرتے۔ حکم دیتے غرض ہر حالت میں دیکھا تھا۔ انہیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہو گا کہ آپ کس قسم کے آدمی تھے۔ اس وقت ہم آپ کو جو چاہیں کہہ لیں۔ لیکن آج تک کسی شہنشاہ نے تاج مرصع پہن کر اس طرح حکومت نہ کی ہو گی جس طرح اس خرقہ پوش انسان نے کی ہے۔ میرے نزدیک اس کی ذات میں اصل ہیرو کے وہ تمام صفات موجود تھے جو اسے تیئس سال کی سخت اور حقیقی آزمائش میں کامیاب

کرانے کے لیے ضروری ہیں۔ آخری الفاظ جو آنحضرتؐ کی زبان سے نکلے ایک دعا ہے، ایک قلب مضطر کے اپنے خالق کی بارگاہ میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مذہب اسلام کی اشاعت نے آپ کی طبیعت میں کوئی خرابی پیدا کردی بلکہ اور اچھا اثر کیا۔ آپ کے حالات میں بہت سی عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً جب آپ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا تو آپ نے اپنے طرز میں جو کچھ فرمایا وہ صداقت سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ عیسوی عقائد سے ملتا جلتا ہے یعنی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ یہی آپ نے اس وقت بھی فرمایا جب آپ نے آزاد کردہ محبوب غلام زیدؓ کی وفات کی خبر سنی۔ زید دوسرے مسلمان تھے۔ یہ غزوہ تبوک میں شہید ہوئے جو یونانیوں سے آنحضرتؐ کی پہلی جنگ تھی۔ ان کی شہادت کا حال سن کر آپ نے فرمایا "اچھا ہوا کہ زیدؓ راہ خدا میں کام آئے۔ وہ اب اپنے مالک سے جا ملے اور ان کا انجام بخیر ہوا۔" لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ کی صاحبزادی نے آپ کو ان کی نعش پر روتے دیکھا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "ایک انسان کو اپنے دوست کی جدائی پر روتا دیکھ رہی ہو۔"

مجھے محمدؐ کا تصنع اور ظاہرداری سے کوسوں دور رہنا بہت پسند ہے۔ مادر صحرا کا یہ سادگی پسند فرزند اپنے بل بوتے پر کام کرتا ہے اور اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط ادعا نہیں کرتا۔ اس میں نہ تو غرور و خودنمائی ہے نہ خوشامد و عاجزی۔ وہ اپنی اصلی حالت میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی عبا پر خود پیوند لگاتا اور اپنی نعلین کی خود مرمت کرتا ہے دوسری طرف نہایت بے تکلفی سے ایران کے بادشاہوں اور یونان کے شہنشاہوں کو ان کے فرائض پر توجہ دلاتا ہے۔ غرض وہ اپنے درجہ اور عزت کا پوری طرح علم رکھتا ہے۔ بدوؤں کے ساتھ خونریز معرکہ آرائیوں میں ظلم و ستم کے بغیر گریز نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں رحم و کرم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضرتؐ نہ تشدد پر اعتذار کرتے ہیں اور نہ رحم و کرم پر افتخار۔ وہ دونوں آپ کے دل کی اصلی صدائیں تھیں جو ارتجالاً بلند ہوگئیں۔ آپ نے ہمیشہ شیریں زبانی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ وقت ضرورت زور اور سختی بھی کی ہے۔ آپ میں لگی لپٹی رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غزوہ تبوک کا آپ بار بار ذکر کرتے تھے۔ اس موقع پر آپ کے ساتھیوں میں سے بعض نے گرمی کی شدت اور فصل کے خراب ہوجانے کا عذر کیا تھا۔ آپ اس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "تمہاری کھیتیاں کتنے دن کام آئیں گی؟ ابدتک ان کا کیا حشر ہوگا؟"

محمدؐ کے اخلاقی اصول کا میلان ہمیشہ خیر کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے قلب کے سچے احساسات ہیں جس کا مطمح نظر صداقت و معدلت رہتا ہے۔ گو اسلام میں مسیحیت کا یہ اصول عفو نہیں پایا جاتا کہ اگر کوئی شخص ایک طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے آگے کر دیا جائے، بلکہ اسلام میں بدلہ لینے کا حکم ہے۔ لیکن ساتھ ہی شرط یہ ہے کہ حد انصاف سے نہ بڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح اسلام کامل مساوات کا علمبردار ہے۔ جیسا کہ ایک اعلیٰ مذہب اور

نہ ہو جس سے نفرت انسانی کو ہونا چاہیئے ۔ اس میں ایک مسلمان کی جان دنیا کے تمام تاج و تخت پر بھاری ہے ۔ نیز اس کی رو سے سب بنی آدم یکساں ہیں ۔ خیرات دینا اسلام میں صرف جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہے ۔ اس میں زکوٰۃ کا نصاب بھی مقرر کر دیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص نہ ادا کرے تو وہ اس کا جواب دہ ہوگا ۔ ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا دسواں حصہ (خواہ وہ کتنا ہی ہو) غریبوں ۔ معذوروں اور محتاجوں کا حق ہے ۔ یہ تمام اصول نہایت عمدہ ہیں ۔ یہ رحم و انصاف اور محبت و انسانیت کے وہ مطالبات ہیں جن کی صدائے بازگشت مادر فطرت کے اس اُمّی فرزند سے بلند ہوئی ۔

عربوں کے حق میں اسلام گویا ظلمت میں نور کا ظہور تھا ۔ جس کے اثر سے ملک عرب پہلے پہل بیدار ہوا ۔ ایک غریب گلہ بان قوم جو ابتدائے آفرینش سے ریگ زاروں میں گمنام پڑی پھر رہی تھی ، اس کی ہدایت کے لیے ایک ہیرو پیغمبر کے لباس میں ایسا پیام دے کر بھیجا گیا جس پر وہ ایمان لا سکی ۔ دیکھو! اب وہ گمنام چرواہے دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں اور وہ حقیر شتربان سارے عالم پر چھا جاتے ہیں ۔ ایک صدی کے اندر عرب کا سکہ دہلی سے غرناطہ تک جاری ہو گیا اور اس کی شجاعت و ذہانت کا آفتاب مدت تک ایک عالم پر ضو فشانی کرتا رہا ۔

ایمان ایک بڑی اور جاں بخش نعمت ہے ۔ جہاں کوئی قوم ایمان لائی تاریخ اس کی عظمت و رفعت کی داستانوں سے معمور ہوئی ۔ عربوں کی قوم ، آنحضرتؐ کی ذات اور ایک صدی کی مدت ۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے گویا ایک چھوٹی سی چنگاری ایسے تودۂ عظیم پر گری جو بظاہر محض انبار خاکستر تھا ۔ مگر وہ انبار آتشگیر مادہ ثابت ہوا جس کے شعلے دہلی سے غرناطہ تک بلند ہوئے اور آسمان سے باتیں کرنے لگے ۔ بڑا انسان ایک برق آسمانی ہوتا ہے اور باقی سب لوگ تودۂ ہیزم کی طرح اس کے منتظر رہتے ہیں جنہیں وہ آن واحد میں شعلۂ روشن بنا دیتا ہے ۔

---


مجلہ "ثقافت"

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے بانی اور ناظم تھے اور ان کی یاد میں ادارہ کے ترجمان مجلۂ ثقافت کا خاص نمبر ترتیب دیا جا رہا ہے ۔ ہماری کوشش ہے کہ یہ نمبر خلیفہ صاحب کی ثروتِ افکار ، علمی فضیلت اور دینی خدمات نیز ان کی دلکش اور ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے مضامین کا ایک نادر مرقع ہو ۔

مرحوم خلیفہ صاحب کے قدر شناسوں اور بالخصوص ان کے احباب و اقربا سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین و تاثرات ارسال کرنے میں ممکنہ عجلت فرمائیں تاکہ وہ اس خصوصی شمارہ میں شامل کئے جا سکیں ۔ براہ کرم مضامین اس پتے پر ارسال فرمائے جائیں :

مدیر ماہنامۂ ثقافت ۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۔ کلب روڈ ۔ لاہور (پاکستان)


---